مراثیِ دبیر میں رثائیت کے عناصر

ڈاکٹر طاہر نواز، اسسٹنٹ پروفیسر، قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی، گلگت بلتستان

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی، اسسٹنٹ پروفیسر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

Mirza Dabeer is one of the most prominent marsiya writers in the history of Urdu literature. Mirza Dabeer belonged to Lucknavi School of Thought. Generally, it is said that elements of mourning are lesser in the marsiyas of Mirza Dabeer. He had focused more on other elements. Marsiya is a literary genre. It deals with the incidents of someone's death. The marsiya writer's main purpose is to make people mourn the dead. In this article, effort has been made to find and elaborate the elements of mourn in the marsiyas of Mirza Dabeer.

Keywords: Mirza Dabeer, Marsiya, Elements of Mourning,

اردو مرثیے پر ہونے والی تنقید، جہاں دیگر مشہور اصنافِ شعر کے مقابلے میں کم ہے، وہاں پر اتنی ہی دلچسپ بھی ہے۔ اس محدود رثائی تنقیدی سرمایے میں بھی سب سے زیادہ کام انیس اور دبیر کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ انیس اور دبیر کے عہدِ حیات میں "انیسیے" اور "دبیریے" کی اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں۔ اردو کے اولین ناقدین میں سے مولانا شبلی نعمانی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں انیس کو دبیر پر فوقیت دے کر جس تنقیدی بحث کا آغاز کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ ہر چند مرزا دبیر کی حمایت میں بعد ازاں بہت کچھ لکھا جاتا رہا اور مولانا شبلی نعمانی کے بہت سے اعتراضات کے جوابات بھی دیے گئے تاہم اب بھی بہت سے امور بحث طلب ہیں اور شاید اس کی ایک بڑی وجہ اردو مرثیے کی تنقید کا محدود اور یک رخہ ہونا بھی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے مرزا دبیر سے متعلق یوں لکھا ہے:

> "الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلاویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصولِ بلاغت کے مراعات، اِن تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت اِن کے کلام کو چھو کر بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور ازکار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا

حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاری ہیں، خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔"(۱)

اس محدود رثائی تنقیدی سرمایے میں بھی بیسویں صدی کے بعض ناقدین کے زیادہ تر مباحث رزمیہ اور مرثیے کے تعلق پر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ رزمیہ کے لیے رزم کا ہونا ضروری ہے جبکہ مرثیہ کے لیے رزم کا ہونا لازم نہیں۔ مرثیہ کے لیے اہم ترین عنصر رثائیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا دبیر کے مرثیوں میں رثائیت کے لوازمات میر انیس کے مقابلے میں کم ہیں۔ دبیر نے رثائیت کی بجائے جنگ کے لوازمات اور منظر نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے۔ دبیر کی مشکل پسندی اور ثقالت ان کی رثائیت کے عمومی تاثر کو زائل کرتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے درج بالا اقتباس کے مطابق مرزا دبیر کے مرثیوں میں اگر یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے تو پھر وہ کون سے عناصر تھے جنھوں نے مرزا دبیر کو اپنے عہد کا اہم ترین مرثیہ گو بنایا؟ درج بالا اوصاف کے بغیر مرثیے میں رثائیت کو کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا دبیر کے مرثیوں میں رثائیت کے عناصر کم تھے تو پھر لوگ ان کے مرثیوں پر رو رو کر بے حال کیوں ہو جاتے تھے۔ یاد رہے کہ مرثیہ گوئی میں کامیاب مرثیہ گو وہی کہلائے گا جو سامعین کو مقامِ گریہ پر لے آئے۔ مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی لیکن حسنِ قبول اور فیض تاثر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو اکثر رونے رُلانے میں کامیاب ہوتا تھا۔"(۲)

مرثیے میں رثائیت کے لیے کردار نگاری، واقعات نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، بین نگاری اور ان میں وحدتِ تاثر اور شدتِ تاثر سے کام لیا جاتا ہے۔ وحدتِ تاثر اور شدتِ تاثر کا ازبس ہونا ضروری ہے وگرنہ مرثیے سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو مرثیہ گو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مرثیہ گو کا مقصد واقعاتِ کربلا کے کرداروں کی عظمت کا بیان اور ان کی مدح و ستائش اور مصائب کے ذکر سے مجلس میں گریہ و بکا پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے کلاسیکی مرثیے کی ہر جز میں احساسِ غم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا تاکہ رثائیت پیدا کی جا سکے۔ دبیر نے بھی اپنے مرثیوں میں رثائیت کے لیے ان عناصر سے مدد لی ہے۔

مرثیے میں کردار نگاری کے حوالے سے مشکل یہ ہے کہ مرثیہ نگار کرداروں کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔ مرثیہ نگار کے سامنے مخصوص کردار ہیں اور اس نے ان میں سے ہی کسی ایک کردار کا مرثیے کے لیے انتخاب کرنا ہے۔ یہ کردار مرثیہ گو سے زیادہ تاریخ کے پابند ہوتے ہیں اور مرثیہ گو تاریخ سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ مرثیے میں مرثیہ گو کا کرداروں کے ساتھ محبت اور تکریم کا تعلق ہوتا ہے۔ مسلسل محبت کا تعلق کردار کو سپاٹ یا جامد بنا دیتا ہے۔ لیکن کامیاب مرثیہ نگار نے ان تمام کرداروں کو یکسانیت سے بچانا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ان تاریخی کرداروں کو جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ انھیں کیسا ہونا چاہیے کی بنیاد پر بھی پیش کرتا ہے۔ مرثیہ گوئی میں کردار نگاری کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ قاری یا سامع اس کردار کے حالاتِ زندگی اور انجام سے پہلے سے ہی باخبر ہوتا ہے۔ ایسے میں سامع یا قاری کو کردار کے ساتھ تعلق

کے اس مقام پر لے آنا جہاں وہ کردار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے، کردار کا غم اسے اپنا غم محسوس ہو تا کہ قاری یا سامع شدتِ غم سے گریہ کرنے لگے۔ دبیر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کردار نگاری پر مکمل توجہ دی ہے۔ دبیر یہ جانتے تھے کہ مرثیہ کردار کے گرد گھومتا ہے۔ مرثیہ میں پیش کی گئی دیگر اشیا(گھوڑا، تلوار، نیزہ، دیگر آلاتِ جنگ) کی وقعت کردار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کردار نگاری جتنی عمدہ ہو گی مرثیے میں رثائیت اتنی بڑھ جائے گی۔ دبیر کی کردار نگاری سے متعلق مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

> "دبیر اپنے کرداروں کے دلوں کی دھڑکنوں کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ ان کی نبضِ رفتار کو اچھی طرح پہچانتا ہے وہ ان کے غم کے ساتھ روتا ہے اور ان کی مسرتوں میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اس کی درون بینی اور فطرت شناسی کے جوہر ہر موقعہ پر نکھرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے ہمعصر شعرا سے بہت بلند ہو تا جاتا ہے۔"(۳)

کردار نگاری سے متعلق مرزا دبیر کے مرثیے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اکثر مرے بابا نے اسیروں کو چھڑایا　　پیاسا جسے دیکھا اسے پانی بھی پلایا
بن باپ کے بچوں پہ سدا رحم ہے کھایا　　آج ان کے یتیموں پہ عجب وقت ہے آیا

سید کا گلا کٹتا ہے کچھ دھیان نہیں ہے
اس فوج میں کیا کوئی مسلمان نہیں ہے
(جب ختم کیا سورۃ والیل قمر نے)

حضرت امام حسینؑ کے وقتَ شہادت پر دبیر نے آپ کی شخصیت،نفسیات، صبر اور درپیش صورتحال کی سادہ اور اتنی پر درد تصویر کشی کی ہے کہ اسے درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے:

جو ظلم آج مجھ پہ ہوئے انتہا نہیں　　شکوے سے پر زبان مری آشنا نہیں
بیٹا جوان مر گیا ماتم کیا نہیں　　بھائی کے شانے کٹ گئے پر کچھ کہا نہیں

ہاتھوں پہ خونِ اصغرؑ بے شیر بہہ گیا
میں صبر کر کے رہ گیا وہ مر کے رہ گیا
(آمد خزاں کی گلشنِ خیر الورا پہ ہے)

مرثیہ میں پیش کیے گئے کردار سے منسلک واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے اور ان واقعات کو اس ترتیب کے ساتھ ہی پیش کرنا ہوتا ہے جو بالآخر شخصِ مرثیہ کی شہادت پر منتج ہوتے ہیں۔ واقعاتی ترتیب میں رد و بدل مرثیہ میں ممکن نہیں۔ ایسا

نہیں ہو سکتا کہ بعد کے واقعات کو پہلے پیش کر دیا جائے۔ پس مرثیہ میں ضروری ہوتا ہے کہ ہر صورتِ واقعہ کو اس کے مقام پر اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری یا سامع کو اس کی صداقت کا یقین آ جائے۔ مرثیے میں واقعات زمینی جغرافیے کے پابند ہوتے ہیں۔ مرثیہ گو چاہ کر بھی شخصِ مرثیہ کو اس مخصوص زمان و مکان (Time & Space) سے باہر نہیں لے جا سکتا۔ مرثیہ گو کو اسی مخصوص جغرافیے میں رہنا پڑتا ہے اور ان ہی واقعات کو پیش کرنا ہوتا ہے جن کا کردار کی زندگی سے تعلق رہا ہو۔ اب ایسی صورت میں جب ایک مخصوص زمان و مکان میں ایک سے زیادہ افراد کا مرثیہ لکھنا ہو تو مرثیوں میں تنوع اور دلچسپی کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مرثیہ گو تنوع کے لیے واقعات کا سہارا لیتا ہے۔ واقعات کے بیان میں دبیر حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ اور انسانی نفسیات سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ دبیر کی واقعہ نگاری کے حوالے سے مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

> "واقعہ نگاری دبیر کا مخصوص فن ہے۔ اس کی انسانی نفسیات اور ذہنی کیفیات سے واقفیت اور اسلوبِ بیان کی خوبی اسے اس صنفِ ادب میں اپنے ہمعصر شعرا سے ممتاز کر دیتی ہے۔" (۴)

امام حسینؑ جب حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ کی شہادت پر ان کی لاشوں کے پاس جاتے ہیں تو ان واقعات کو دبیر نے علیحدہ علیحدہ کیفیات کے ساتھ بیان کر کے واقعاتی تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرت عباسؑ کی شہادت پر جب حضرت امام حسینؑ ان کے پاس پہنچتے ہیں تو اس واقعے کو دبیر نے یوں بیان کیا ہے:

مشتاق ہوں آواز کا، آواز سنائو　　عباسؑ حسینؑ آیا ہے گردن تو اٹھائو
بیتاب ہوں سینہ سے مرے سینہ ملائو　　کیا کہہ کے کلیجہ کو سنبھالوں یہ بتائو
بتیس برس تم مری گودی میں پلے ہو
یاں کس کے سہارے پہ ہمیں چھوڑ چلے ہو
(ہر آہ علم ہے یہ عزا خانہ ہے کس کا)

حضرت علی اکبرؑ کی لاش پر امام حسینؑ کی حالت کا بیان دبیر نے کچھ یوں کیا ہے:

آیا حسینؑ آیا، کدھر تم ہو اے پسر　　اکبرؑ پکارے، قبلہ و کعبہ ادھر، ادھر
ہے ہے حضور ضعفِ بصارت ہے اس قدر　　پہلو میں ہے غلام اور آتا نہیں نظر
یوں مڑ کے لاش پر شہِ غمناک گر پڑے
گویا زمین پہ قبہ افلاک گر پڑے
(جب موسمِ جوانی اکبر گزر گیا)

مرثیہ میں رثائیت پیدا کرنے کا ایک اہم ترین عمل مکالمہ نگاری ہے۔ مکالمہ نگاری کے ذریعے ہی کردار کی داخلیت کو قاری یا سامع کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ گو کردار سے متعلق سب کچھ خود ہی نہیں بتانا چاہتا بلکہ مکالمہ نگاری کے ذریعے وہ کردار کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ یوں وہ کردار سامع یا قاری کے سامنے متکلم صورت میں آتا ہے۔ اس خاص لمحے پر اُس مخصوص کردار کی ذہنی کیفیات کیا تھیں، ان کا علم مکالمہ نگاری کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ مرثیہ گو کا کمال یہ ہے کہ وہ مکالمہ نگاری پر رثائیت کی چھاپ لگا کر اسے حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ قاری یا سامع اس یقین پر پہنچ جاتے ہیں کہ بعین ایسے ہی گفتگو ہوئی ہوگی۔

مکالمہ کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ہی کردار کا ذہنی پسِ منظر، اس کی خاندانی روایات، قوتِ فیصلہ، داخلی کیفیات اور معیارِ اخلاق سامنے آتے ہیں۔ مکالمہ نگاری میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ کردار کے ذہنی پسِ منظر، عمر اور مرتبے کے مطابق صورتِ واقعہ سے متعلق اس طرح گفتگو کروانا کہ اس کردار کی شخصیت نہ صرف ابھر کو سامنے آئے بلکہ وہ دوسروں کرداروں سے ممیز بھی ہو جائے۔ پس کردار اور اس کے مکالمے میں مطابقت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مکالمہ نگاری رثائی شدتِ تاثر کو بڑھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رثائی مکالمہ نگاری ایک مشکل امر ہے لیکن مرزا دبیر مکالمہ نگاری میں درجہ کمال پر فائز ہیں۔ ان کی مکالمہ نگاری سے متعلق مرزا محمد زمان آزردہ لکھتے ہیں:

> "مرزا دبیر کے یہاں مکالمہ۔۔۔(سے) کردار کا ذہنی پسِ منظر، اس کی خاندانی روایات اور اس کی فیصلہ کرنے کی قوت، داخلی کیفیت اور خارجی حالت، معیارِ اخلاق وغیرہ سب ہی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مرثیہ کے کردار، عمر اور درجہ میں ایک دوسرے سے مختلف تو ہیں البتہ منزل سب کی ایک ہے۔ ارادہ سب کا ایک ہے۔ اس لیے ان میں فرق دکھانا ایک بہت ہی مشکل کام ہے مگر مرزا دبیر نے مکالمہ کے ذریعہ ان کی شخصیتوں کے ان پہلوں کی طرف اشارے کیے ہیں جن سے یہ کردار ایک دوسرے سے متمیز ہوتے ہیں۔"(۵)

وقتِ آخر امام حسینؑ جب خیام میں رخصت ہونے آتے ہیں تو حضرت زینبؑ کے سوال پر کہ آپ کے ساتھی کہاں گئے، امام حسینؑ کا جواب ملاحظہ ہو۔ دبیر نے اس ایک بند میں امام حسینؑ کے تمام دکھ اور درد کو سمیٹ دیا ہے۔

زینبؑ نے رو کے پوچھا کہ یاور کہاں گئے ‎ ‎ ‎ عباسؑ و قاسمؑ و علی اکبرؑ کہاں گئے
مسلم کے لال، ضیغمِ حیدرِ کہاں گئے ‎ ‎ ‎ میرے پسر، عقیل کے دلبر کہاں گئے

کوئی نہیں رکابِ شہِ دیں پناہ میں
رو کر کہا کہ سوتے ہیں سب قتل گاہ میں

ہمشیر، سب ہمارے مددگار مر گئے ‎ ‎ ‎ بھائی، بھتیجے، بھانجے، انصار مر گئے

شانے کٹا کے بھائی علمدار مر گئے   اکبرؑ بھی کھا کے نیزہ خونخوار مر گئے

رخصت دو جلد فاطمہؑ کے نورِ عین کو
جُز مرگ اب نہیں کوئی چارہ حسینؑ کو
(آمد خزاں کی گلشن خیر الورا پہ ہے)

مراثی دبیر میں رثائیت کا ایک اہم پہلو جذبات نگاری ہے۔ جذبات نگاری کا کمال یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے انسان کے احساسات کو اپنے احساسات سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ یعنی قاری یا سامع شخصِ مرثیہ کے درد و غم کو اپنا درد و غم سمجھنے لگے۔ اس کے زخم کی تکلیف کو وہ اپنے بدن پر بھی محسوس کرے۔ اس شخص کی تڑپ کردار یا سامع کو بھی بے قرار کر دے۔ شخصِ مرثیہ کے لیے وہ اپنے دل میں حرکت محسوس کرے۔ مہر و محبت، مسرت اور جوش، شکوہ و شکایات اور غیظ و غضب کے نقشے یوں کھینچے جائیں کہ سننے یا پڑھنے والے کے احساسات میں ان جذبات کی آمیزش ہو جائے۔ مرثیہ گو کا بنیادی مقصد پڑھنے یا سننے والے کی شخصِ مرثیہ کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنا اور اس کے غم میں رلانا ہوتا ہے۔ ہمدردی اور رونے کا تعلق جذبات کے ساتھ ہے۔ جب تک پڑھنے یا سننے والا شخصِ مرثیہ کے درد کو اپنا درد اور اس کے غم کو اپنا غم نہیں سمجھے گا وہ مقامِ گریہ تک نہیں آئے گا۔ رثائیت پیدا کرنے کے لیے جذبات نگاری کا ہونا بہت ضروری ہے لہٰذا جذبات نگاری کا مرثیے میں ہر لمحے خیال رکھا جاتا ہے اور مرزا دبیر نے اسی سے کام لیا ہے۔ مرزا دبیر کی جذبات نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں حسبِ منشا جذبات ابھارتے ہیں۔ اس حوالے سے پروین اختر لکھتی ہیں:

"ان کے ہاں جذبوں کی فراوانی نہیں بلکہ شدت اور عمق ہے۔ دبیر رنج و غم کی مختلف شدتوں کو کامیابی سے واضح کر دیتے ہیں۔ اظہارِ غم کے لیے جو الفاظ وہ منتخب کرتے ہیں وہ شدتِ الم کے اس مخصوص مرحلے کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔"(٦)

اس ضمن میں مدینہ سے روانگی کے وقت حضرت صغریٰ کی حالت کا بیان دبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

دامن پکڑ کے کہتی ہے بابا کب آئو گے   لے جائو گے ہمیں کہ یہیں چھوڑ جائو گے
بیمار کی خبر بھی کسی سے منگائو گے   یا پیار میں سکینہؑ کے ہم کو بھلائو گے

لینے کو میرے بھیجو گے کس کو مدینے سے
یا نا امید ہی میں رہوں اپنے جینے سے
(ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے)

دبیر نے مرثیے میں رثائیت پیدا کرنے کے لیے کسی ایک جز کو ہی نہیں مختص کیا تھا بلکہ انہوں نے مرثیے کے ہر جز میں رثائیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دبیر سے متعلق عموماً یہ تاثر قائم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مرثیوں میں اول جز یعنی چہرہ میں ثقالت، دور از کار تشبیہات و استعارات اور آزاد تلازمہ سے کام لیتے ہیں۔ زیرِ نظر بند ان کے مرثیے کا پہلا بند ہے۔ اس بند میں سلاست اور رثائیت ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کہ ملنے کی آس ہے پھرتی ہے آس پاس، یہ جینے سے یاس ہے
کہتی ہے کیا کروں میں دہائی حسینؑ کی
پُتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی
(بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مرثیہ صرف لکھا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ مجمع عام میں پڑھا بھی جاتا تھا۔ اسی لیے مرثیہ گو کا بنیادی مقصد مرثیہ کے لوازمات کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ مجالسِ عزا کی مانگ پوری کرنا تھا۔ جو مرثیہ زیادہ ماتم اور سینہ کوبی کا باعث ہوتا تھا وہی کامیاب ترین سمجھا جاتا تھا۔ یوں رثا لکھنوی مرثیے کی غائت تھی۔ مجلسی تقاضوں کے پیشِ نظر دبیر اپنے سامعین و ناظرین کے تخیل کو کسی بھی موقع پر آزاد نہیں چھوڑتے تھے بلکہ موقع بہ موقع بین کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ بین مرثیے کا کلائمکس ہوتا ہے۔ مرثیے کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔ اسی مقام پر سب سے زیادہ گریہ وبکا ہوتا ہے۔ مرزا دبیر کو بین پڑھنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے پڑھنے میں عجیب وقار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بین اس طرز سے پڑھتے تھے کہ مجلس میں روتے روتے اکثر آدمی بے ہوش جاتے تھے۔ دبیر کی بین نگاری اور پڑھت سے متعلق ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں:

"مرزا دبیر کو خاص کر بین کے مقامات پڑھنے میں کمال حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ مرزا دبیر کے پڑھنے کا انداز انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا۔"(۷)

دبیر کے لکھے بین شدتِ جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ کردار کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی شخصیت کی عکاسی بھی خوب کرتے ہیں۔ حضرت عباس کی شہادت پر حضرت زینبؑ کا بین اس کی عمدہ مثال ہے:

زینبؑ نے کہا: سونے کی یہ کون گھڑی ہے اے بھائی اٹھو! فوجِ ستم سر پہ کھڑی ہے
رولو نگی میں، رونے کو تو سب عمر پڑی ہے پر اب تو مجھے تم سے شکایت یہ بڑی ہے
اس وقت سدھارے جو ملاقاتِ نبی ﷺ کو
عباس! کسے سونپا حسینؑ ابنِ علیؑ کو

(سیفی کا نمونہ مِری شمشیر زباں ہے)

ایس اے صدیقی مرزا دبیر کے مرثیوں میں رثائیت سے متعلق لکھتے ہیں:

"دبیر کی شاعری کا ایک اہم ترین عنصر بین (رثائیت) ہے چنانچہ طبیعت کے لگائو اور ایک عرصے کی مشق و مزاولت سے ان کا فنِ رثا خاصا نکھر گیا تھا۔ دیگر اجزائے مرثیہ کے مقابلے میں یہ فن ان کے یہاں زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے۔ لیکن دبیر کے بینیہ آہنگ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں بین کو صرف شہادت تک محدود نہ کر دیا جائے بلکہ ہر ایسا واقعہ جس کا بیان گریہ خیزی کا سبب بن سکتا ہو اس کا مطالعہ اس عنوان کے تحت کر لینا مناسب ہے۔"(۸)

دبیر صرف مرثیہ نگار ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے مرثیے خود پڑھتے بھی تھے۔ مرثیے کی پڑھت صرف تحریر کا مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فن ہے۔ رثائی نگارش اور پڑھت میں ان کا مقابلہ کسی اور سے نہیں بلکہ میر انیس سے تھا۔ اسی لیے دبیر نے بلند خیالی اور مشکل پسندی کے باوجود رثائیت کو مرثیے میں سے کم نہیں ہونے دیا۔ بلند خیالی اور مشکل پسندی سے انہوں نے اپنے مرثیوں میں اس لیے کام لیا ہے کہ وہ جس لکھنوی دبستان سے تعلق رکھتے تھے مشکل پسندی اور بلند خیالی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ سامعین ان کے اس انداز کو پسند کرتے تھے۔ مرثیہ لکھنوی تمدن کا حصہ تھا اور دبیر لکھنوی تمدن کے نمائندہ تھے۔ دبیر کی رثائیت کو سمجھنے کے لیے لکھنوی تمدن اور مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ لکھنوی مزاج میں درد و غم، دکھ، تکلیف، مصیبت کے اظہار میں ایک رکھ رکھائو تھا۔ دبیر نے اس رکھ رکھائو کو اپنے مرثیوں میں رثائیت پیدا کرنے کے لیے ملحوظ رکھا ہے۔ دبیر کے مرثیوں میں رثائیت کو صرف شہادت اور بین تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ رثائیت ان کے مرثیوں کے تمام اجزا میں ملتی ہے۔ دبیر کے سامعین مجلسی تہذیب سے آگاہ تھے اسی لیے دبیر کے مرثیے نہ تو ان کے لیے مشکل تھے اور نہ ہی رثائیت سے عاری۔ پس دبیر کی رثائیت کا تقابل اگر انیس سے کرنا مقصود ہو تو اس ضمن میں لکھنوی مزاج کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر دبیر کی رثائیت کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، لالہ رام نرائن لعل بک سیلر، الہ آباد ۱۹۳۶، ص ۲۸۲

۲۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۷، ص ۵۳۷

۳۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۲۲۲

۴۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۲۵۳

۵۔ مرزا محمد زماں آزردہ، مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے، مرزا پبلی کیشنز، حسن آباد، ۱۹۸۱، ص ۲۷۸

۶۔ پروین اختر، اردو مرثیے کا ارتقا، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص ۲۳۲

۷۔ سید تقی عابدی، ڈاکٹر، مجتہدِ نظم مرزا دبیر (حیات، شخصیت اور فن)، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۳۰

۸۔ ایس اے صدیقی، مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری، راحت پریس دیوبند، ۱۹۸۰، ص ۳۰۶